ڈارون کا نظریۂ ارتقاء[1]

عبدالحمید صدیقی

جن کتابوں نے جدید یورپین کلچر کی تشکیل و تعمیر میں سب سے اہم حصہ لیا ہے ان میں ایک تو کوپرنکس (COPERICUS) کی کتاب (DE REVOLUTIONS ORBIUM) ہے جو ۱۵۴۳ء میں شائع ہوئی دوسری چارلس ڈارون (CHARLES DARWIN) کی کتاب اصل الانواع (ORIGIN OF SPECIES) جو ۱۸۵۹ء میں پہلی بار طبع ہوئی۔ کوپرنکس کی کتاب میں کائنات کے وجود کے بارے میں جو مختلف نظریات پائے جاتے ہیں اُن کی تاریخ جدید اس طرز پر مرتب کی گئی ہے کہ خدا پر یقین و ایمان خود بخود متزلزل ہو جاتا ہے۔ ڈارون کی کتاب اصل الانواع میں اگرچہ ہمیں ارتقاء کے متعلق بحث ملتی ہے لیکن اسے اس نہج پر اٹھایا گیا ہے کہ خالقِ کائنات اپنی اس کائنات سے خود بخود منتفی ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔

ایک انسان جب سرسری طور پر ان کتب کا مطالعہ کرتا ہے تو وہ ان میں حیرت انگیز جدت اور "نیا پن" محسوس کرتا ہے۔ لیکن وہ شخص جو اسی طرز کے دوسرے لٹریچر پر بھی نگاہ رکھتا ہے وہ اس حقیقت سے پوری طرح واقف ہے کہ ان حضرات کو جو ہمارے اس عہد میں غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی ہے اُس کی وجہ یہ نہیں کہ ان کے خیالات و افکار میں اپنے پیشروؤں کے مقابلہ میں زیادہ صحت ہے یا ان میں کسی قسم کی کوئی لغزش نہیں پائی جاتی۔ انہیں جو ہمارے اس عہد میں قبولِ عام نصیب ہوا ہے تو اس کے اسباب اور وجوہات کچھ دوسرے ہیں۔

ڈارون کے نظریۂ ارتقاء کی مقبولیت کی اصل وجہ یورپ میں عقلیت پرستی نے جنم لیا تو اہلِ کلیسا نے اس

---

[1] یہ مضمون بھی "عقلیت پرستوں کی خام خیالیاں" کے سلسلے کی ایک کڑی ہے اور اسے بھی لون کی کتاب "عقلیت سے بغاوت" سے اخذ کیا گیا ہے۔

تحریک کو کسی صحیح راہ پر ڈالنے کی بجائے اس کی اندھا دھند مخالفت شروع کر دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ "اہلِ مذہب" اور "اہلِ خرد" دو مخالف اور متحارب گروہوں میں بٹ گئے اور ان دونوں میں بدقسمتی سے ایک ایسی جذباتی کشمکش شروع ہوئی جس میں چڑ اور ضد سے بہک کر تبدیلی کے جذبات خالص الحاد کے راستے پر پڑ گئے۔ اس قسم کی تلاطم خیز فضا میں جب لوگوں کے فکری جہاز بالکل بے لنگر ہو چکے ہوں اس بات کی توقع کرنا کہ لوگ افکار و نظریات کی صحت یا عدم صحت کا فیصلہ جذبات کی شعلہ فشانیوں کی بجائے فہم و فراست کی معتدل میزان پر تول کر کریں گے، بالکل عبث اور بیکار ہے۔ ان حالات میں ہیجانات ہی لوگوں کی رہنمائی کرتے ہیں۔ اور انہیں نظریات کو مقبولیت حاصل ہوتی ہے جو عوام کے دلپسند رجحانات سے ہم آہنگ ہوں۔ ڈارون کے نظریۂ ارتقاء کی شہرت کے پس پردہ بھی دراصل یہی محرک کارفرما ہے۔ اس تحریکِ الحاد میں چونکہ زندگی کی عمارت اس بنیاد پر تعمیر کرنا مقصود تھی کہ اس کائنات میں اصل صرف مادہ ہے۔ اس لیے مفکرین نے اس قسم کے فلسفے گھڑنے شروع کیے جن کی رو سے نمو، حرکت ارادی، احساس و شعور اور فکر سب اسی مادہ کے خواص قرار پائے انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ حیوان اور انسان سب کے سب مشینیں ہیں جو طبعی قوانین کے تحت چل رہی ہیں۔ ان مشینوں کے پرزے جس طور سے تربیت پاتے ہیں، اسی قسم کے افعال ان سے صادر ہوتے ہیں۔ ان میں کوئی اختیار اور کوئی ارادہ نہیں۔ اور اس سے بڑھ کر یہ پوری کائنات کسی خالق کی کرشمہ سازی نہیں بلکہ محض بخت و اتفاق کا نتیجہ ہے۔ اس کائنات کا نظام ایک اندھی بہری قوت کے ہاتھ میں ہے جسے لوگ "لزوم" کہتے ہیں۔ اس نظام میں کسی الہامی ہدایت کی ضرورت نہیں، یہاں کسی واجب الاطاعت نظامِ اخلاق کے لیے گنجائش نہیں، ڈارون کا نظریۂ ارتقاء چونکہ ان سب تصورات کے لیے ایک فکری بنیاد فراہم کرتا ہے اس لیے لوگوں نے اسے اپنے دل کی ایک فطری پکار سمجھتے ہوئے نہ صرف اسے فوراً قبول کیا بلکہ مسرت اور خوشی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ اس گرمجوشی سے اس کا خیر مقدم کیا گویا کہ وہ اس کے لیے پہلے سے سراپا انتظار تھے اور اس تاک میں تھے کہ کوئی اٹھے اور انہیں ایک ایسا عملی مفروضہ (WORKING HYPOTHESIS) مہیا کرے جس کی مدد سے

وہ اپنے فلسفۂ الحاد کی پوری عمارت بآسانی تعمیر کر سکیں۔ مشہور سائنس دان ایکس ہل (UEXHULL) اس نظریہ کی مقبولیت کے اسباب و علل پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"ڈارونیت سائنس سے زیادہ ایک مذہب ہے۔ یہ نظریہ جن حقائق پر مبنی ہے اُن میں وہ منطقی ربط مفقود ہے جو حقیقتاً سائنس کی جان ہوتا ہے لیکن چونکہ اس میں بعض چیزیں لوگوں کی دلپسند ہیں اس لیے اس خامی کے باوجود اس کے خلاف جس قدر دلائل دیئے جاتے ہیں وہ بیکار ثابت ہوتے ہیں۔ یہ نظریہ نام ہے ایک ایسے عزم صمیم کا جس کے پیش نظر کائنات سے نظم و ضبط کے اصول کو مٹانا ہے۔ اس طرح سے ارتقاء کا نظریہ ہزاروں لوگوں کا ایک مقدس عقیدہ بن گیا ہے ---- ایک ایسا عقیدہ جس کا سائنس کی غیر جانبدارانہ تحقیق سے قطعاً کوئی تعلق نہیں۔ اس کے ذریعہ ارتقاء کی توجیہ تخلیق کے باطن میں کسی حکیم کے ارادے اور حکمت کو تسلیم یا فرض کیے بغیر کی جا سکتی ہے۔"

ڈارون کے پیشرو آئیے اب ایک نظر یہ دیکھیں کہ ڈارون سے پہلے کن کن اصحاب فکر نے اس نظریہ کو پیش کیا۔

ارتقاء کے لفظ کو اگر انواع کی تبدیلی کے ہم معنی لیا جائے تو معلوم ہو گا کہ یہ نظریہ کوئی جدید نہیں ہے البتہ اس نظریے نے جو سائنٹفک شکل اختیار کی ہے وہ ضرور جدید ہے اور اس کی تاریخ سترھویں صدی سے پیچھے نہیں جاتی۔ اٹھارھویں صدی میں یورپ کے سائنٹفک حلقے بکثرت نظریۂ ارتقاء سے بحث کرتے نظر آتے ہیں۔

سیموئیل بٹلر (SAMUAL BUTLER) نے اپنی کتاب ارتقاء قدیم و جدید (EVOLUTION OLD & NEW) میں اس نظریے کی جو تاریخ بیان کی ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈارون سے پہلے بفون (BUFFON) اراسمس ڈارون (ERASMUS DARWIN) (چارلس ڈارون کا دادا) اور لامارک (LAMAREK) اس نظریے کو پیش کر چکے تھے۔ بٹلر کی رائے میں ڈارون کی بجائے بفون اس کا مستحق ہے کہ اس کو نظریۂ ارتقا کا پہلا منکشف قرار دیا جائے مگر

خود بفون نے بھی اس تخیل کا استفادہ ڈے کارٹ (DESCARTES) اور لائبنٹز سے کیا تھا۔

بفون ۱۷۰۷ء میں پیدا ہوا، اور ۱۷۸۸ء میں فوت ہوا۔ اس کے بعد ڈارون کا دادا ارامس ڈارون آیا۔ وہ ۱۷۳۱ء میں پیدا ہوا، ۱۸۰۲ء میں فوت ہوا۔ اُس نے بفون کے نظریے کو اور زیادہ ترقی دی۔ بفون کی رائے یہ تھی کہ ارتقا نتیجہ ہے حیوان اور اس کے ماحول کے درمیان تعامل کا۔ ماحول نئی نئی ضرورتیں پیدا کرتا ہے اور ان ضرورتوں کو مہیا کرنے کے لیے حیوان کی کوششیں اس کے اندر نئی عادتیں پیدا کرتی ہیں اور یہ نئی عادتیں جسم میں تغیر اور نئے آلات کی تخلیق کا باعث ہوتی ہیں۔

مشہور فرانسیسی نیچری لامارک ۱۷۴۴ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۲۹ء میں فوت ہوا۔ اس نے اور بھی تفصیل کے ساتھ اس نظریے کو بیان کیا۔ اُس کا خیال یہ ہے کہ جن اعضاء کو استعمال کرنے کے زیادہ مواقع پیش آتے ہیں۔ وہ ترقی کرتے اور بڑھتے چلے جاتے ہیں اور جن کو استعمال کے مواقع کم پیش آتے ہیں۔ وہ گھٹتے اور رفتہ رفتہ غائب ہو جاتے ہیں۔

ڈارون کی فکری اساس چارلس ڈارون جسے شہرہ آفاق نظریۂ ارتقاء کے منکشف ہونے کا ادعا ہے وہ ۱۸۰۹ء میں پیدا ہوا۔ اس نے اپنے دادا کے نظریات پڑھے تھے۔ ارتقاء کا مسئلہ اس کی خاندانی چیز تھا۔ لیکن اسے جس چیز نے ایک "ارتقائی" بنایا وہ مالتھس کے نظریات اور خود اُس کے اپنے اکتشافی سفر تھے جو اس نے ۱۸۳۱ء اور ۱۸۳۶ء کے دوران ایشیائی جزیروں، جنوبی امریکہ کے ساحلوں، نیوزی لینڈ، آسٹریلیا، مارشیس، برازیل میں کیے۔ اس سیاحت سے وہ بہت کچھ مواد لیکر آیا اور اُس کا ایک خاص ترتیب کے ساتھ مطالعہ شروع کیا۔ ۱۸۳۸ء میں اُس نے مالتھس کا آبادی پر مقالہ پڑھا اور یہاں سے اس کو تنازع للبقا کے نظریے کا سراغ ملا۔

مالتھس جو خاندان کے اعتبار سے ایک پادری تھا، یہ ثابت کرتا ہے کہ انسان کی نسل اس تیزی سے بڑھتی ہے کہ وسائل معیشت اس کی ترقی اور تکثر کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ ڈارون نے اس پر یہ استدلال کیا کہ انسان سے بہت زیادہ تیزی کے ساتھ حیوانات اور نباتات کی نسل بڑھتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حیوانات اور نباتات کی تعداد سال بسال بہت زیادہ

بڑھ جاتی ہے۔ لامحالہ کوئی ایسی قوت ضرور ہونی چاہیے جو ان کی تعداد کو ایک خاص حد تک پہنچنے کے بعد بڑھنے سے روک دیتی ہو ورنہ روئے زمین سال دو سال ہی میں انواع حیوانات سے پٹ جائے یہ مامور دافع (ELIMINTING AGENT) ڈارون کی رائے میں تنازع للبقا ہے۔ اور یہیں سے مشہور نظریہ انتخاب طبیعی (NATURAL SELECTION) کا بھی سرا ملتا ہے۔

ڈارون کی کتاب "اصل الانواع" (ORIGIN OF SPECIES) کا خلاصہ حسب ذیل ہے:-

"ایک ہی نوع کے مختلف افراد میں تھوڑا بہت اختلاف ہوتا ہے۔ یہ اختلافات اگرچہ فرداً فرداً محض خفیف سے ہوتے ہیں، مگر پھر بھی حقیقی ہوتے ہیں اور انہیں کو افراد کے مواقع بقا میں پوری پوری مداخلت حاصل ہوتی ہے۔ بعض افراد ہلکے پھلکے ہوتے ہیں اور انہیں دشمن سے بھاگ جانے کا زیادہ موقع ملتا ہے۔ بعض دوسرے افراد سردی سے بچنے کا زیادہ سامان رکھتے ہیں اور غیر معمولی سردی میں زندہ رہنے کے زیادہ مواقع انہیں حاصل ہوتے ہیں۔ ان مشاق و مصون (FOV OURED) افراد کی نسل وراثت میں ان وسائل بقا و تحفظ کو پاتی ہے اور اس طرح اس کو تنازع للبقا میں کامیابی کے ساتھ دوسرے افراد سے مقابلہ کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ ہر پشت میں وہ افراد جو بقا کی کم تر قابلیت رکھتے ہیں زیادہ تیزی سے مر جاتے ہیں اور ان کی نسل کم سے کم تر ہوتی جاتی ہے۔ بخلاف اس کے جو ان کے مقابلے میں صالح تر افراد ہیں وہ زیادہ دیر تک زندہ رہتے ہیں اور زیادہ کثیر نسل چھوڑ جاتے ہیں۔ ہر پشت میں افراد کی ایک محدود تعداد افزائش نسل سے بچ جاتی ہے اور جو افراد بچ جاتے ہیں ان کے ذریعے وہ مخصوص امتیازی خوبیاں جاری رہتی ہیں جنہوں نے ان کو تنازع للبقا میں کامیابی کا موقع دیا۔"

ڈارون اپنے اس نظریہ کو زرافہ کی مثال سے واضح کرتا ہے۔ اس کا خیال یہ ہے کہ قحط اور خشک سالی کے زمانے میں سبزی کھانے والے جانوروں میں جو جانور زیادہ لمبی گردن رکھتے ہیں ان کو کوتاہ گردن والے جانوروں کی بہ نسبت اونچے درختوں کی شاخوں تک پہنچنے کا زیادہ موقع ملتا ہے اور اس لیے وہ زندہ رہنے کے زیادہ مواقع رکھتے ہیں۔ پہلی قسم کے جانور بقاء اور تناسل میں کامیاب

ہوتے ہیں اور چھوٹی گردن والے جانور ہلاک ہو جاتے ہیں۔ ہر پشت میں یہ عمل جاری رہتا ہے اور گردن کی اوسط طوالت ہر پشت میں بڑھتی چلی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ یہ وجہ زرافہ کو پیدا کرنے کا سبب بنتی ہے

ڈارون کے برعکس لامارک زرافہ کی گردن کو "استعمال" اور "کوشش" کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔ جس طرح لوہار کا بازو استعمال سے نمو پاتا اور قوی ہوتا ہے۔ اسی طرح جانور نے گردن کو ابھار ابھار کے پتے کھانے کی کوشش کی۔ اس کی گردن بڑھتے بڑھتے لمبی ہوتی چلی گئی۔

لامارک اور ڈارون میں فرق یہ ہے کہ لامارک کی رائے میں زیادہ ہوشیار اور زیادہ کوشش کرنے والا زرافہ خود اپنا انتخاب کرتا ہے اور اپنی کوشش کا انعام بقا کی صورت میں پاتا ہے۔ بخلاف اس کے ڈارون کے نزدیک انتخاب طبیعی ہر پشت میں اندھا دھند ان زرافوں کا انتخاب کرتا ہے جو اپنی کوشش کے نتیجے کے طور پر نہیں بلکہ اتفاقاً زیادہ لمبی گردن سے سرفراز ہوئے ہیں۔

یہ ہے مختصر طور پر وہ نظریہ ارتقاء جو جدید تہذیب و تمدن کی فکری اساس ہے۔ اب ہم نہایت ہی اختصار کے ساتھ اُن اعتراضات کو پیش کرتے ہیں جو ڈارون کے اس نظریہ پر مختلف حکما اور اہلِ علم نے پیش کیے۔

ڈارون کی خام خیالیاں

سیموئیل بٹلر اس نظریہ پر اعتراض کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اگر تمام عالم میں نہایت نازک اور حکیمانہ خلقتوں کا ضرورت اور محل کے مناسبِ حال بننا اور ڈھل جانا، محض اتفاقی طور پر مناسبِ حال اسباب کے جمع ہونے کا نتیجہ ہے تو پھر یہ بھی مان لینا چاہیے کہ اسٹیم انجن کی ایجاد بھی صرف انسان کی اتفاقی کوششوں کا ثمرہ ہے۔ انسان اس چیز کا قطعاً ضرورت مند نہ تھا لیکن جب بھاپ کا دیو اتفاق سے معرضِ وجود میں آگیا تو پھر انسان نے اس سے فائدہ اٹھانا شروع کیا۔

دوسرے اگر انتخاب طبیعی ہی مختلف انواع کے بقا کا ضامن ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر لمبی گردن والے جانور کم کیوں ہیں۔ جس طرح زرافہ اس چیز کا محتاج ہے کہ وہ اونچے درختوں تک رسائی حاصل کرے اسی طرح وہ سارے جانور، جو درختوں کے پتے کھاتے ہیں، وہ بھی اس بات کے حاجتمند ہیں کہ اُن کی گردنیں لمبی ہوں۔ یہ ضرورت تو بے شمار جانوروں کو لاحق ہوتی ہے، اس لیے

ایسے جانوروں کی تعداد بھی بہت زیادہ ہونی چاہیے۔ لیکن امرِ واقعہ اس کے برعکس ہے۔ اس اعتراض کا کوئی جواب نہ ڈاروِن دے سکا اور نہ لامارک۔ ڈاروِن خود اعتراف کرتا ہے:

"میرے لیے اس حقیقت کو سمجھنا بہت مشکل ہے کہ وہ لمبی گردن جو زرافہ کے حق میں اتنی مفید اور کارآمد ثابت ہوئی ہے اور جس کی وجہ سے اُسے بقا نصیب ہُوا ہے وہ اسی نوع کے دوسرے جانوروں کو کیوں نصیب نہیں ہوئی؟"

اگر ڈاروِن کا نظریہ صحیح اور درست ہے تو یہ توقع کرنا ہرگز خلافِ عقل نہیں ہے کہ ایسے ہی زرافہ کی مانند گردنیں رکھنے والے جانور دنیا کے تمام قطعات میں پیدا ہونے چاہئیں۔ اگر انتخابِ طبیعی کا عمل واقعی دنیا میں جاری ہے تو اس کو عالمگیر ہونا چاہیے اور اس میں یکسانی پائی جانی چاہیے۔

اب ذرا اسی معاملہ کو ایک دوسرے پہلو سے دیکھیے۔

کوئی شخص اس حقیقت سے تو انکار نہیں کر سکتا کہ خلقت کی ابتدا زیادہ سادہ چیزوں سے ہوئی اور اس کے بعد رفتہ رفتہ زیادہ پیچیدہ صورتیں رونما ہوئی ہیں۔ عام طور پر یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ زمین پر نباتات پہلے پیدا ہوئے، پھر حیوانات کی نوبت آئی، پھر انسان کی۔ مگر یہ ارتقاء لازماً تناسلی ارتقاء نہیں ہے۔ اور تقدم و تاخر زمانی اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ متاخر شئے متقدم سے بطریقِ تناسل پیدا ہوئی ہے۔ پہلے چپوؤں سے چلنے والی کشتیاں تھیں، پھر اُن کے چلانے کے لیے بادبانوں کو استعمال کیا جانے لگا اور اب انسان کی قوتِ تخلیق نے انہیں بھاپ کی قوت سے چلانا سیکھا ہے۔ یہ سب کچھ یقیناً ایک ارتقاء اور ترقی ہے لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ سٹیم سے چلنے والے جہاز پرانی کشتیوں کی نسل سے ہیں۔ ہمیں توارث یا وراثت اور اصل و ذریت (DESCENT) کے فرق کو ضرور ملحوظِ خاطر رکھنا چاہیے۔ شاہ جہاں کے بعد اورنگ زیب تخت نشین ہُوا۔ وہ جانشین بھی تھا اور اس کی نسل سے بھی تھا۔ علاؤالدین خلجی کے بعد غیاث الدین ہندوستان کا بادشاہ ہُوا۔ وہ اس کا جانشین و خلف تھا مگر اُس کی نسل سے نہ تھا۔

اسی طرح اس حقیقت سے بھی کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ جو شے باقی رہنے کی صلاحیت

نہیں رکھتی وہ ہلاک ہو جاتی ہے اور جو اصلح ہے وہی الباقی ہے۔ یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کی دریافت کا سہرا ڈارون کے سر ہو۔ ہر شخص یہ بات شب و روز کے مشاہدے اور تجربے سے جانتا ہے البتہ جو چیز نئی ہے اور جس کا ادعا ڈارون نے کیا ہے وہ یہ مسلّم صداقت نہیں ہے کہ زندہ رہنے کی صلاحیت رکھنے والا زندہ رہتا ہے بلکہ یہ ہے کہ تعامل اصلح ہی انواع کے تغیر و تبدل میں آخری اور فیصلہ کن قوت ہے۔ اگر ہم اس حقیقت کو مان لیں تو پھر ہمیں یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ انتخاب طبیعی کا پورا عمل ایک لگے بندھے ضابطے اور پلان کے مطابق چل رہا ہے اور اس کے پیچھے ایک گہری حکمت اور دانائی موجود ہے جو دنیا کے سارے تغیرات پر پوری طرح فرمانروائی کر رہی ہے۔ ڈارون کے نظریہ میں یہ تضاد بڑا ہی دلچسپ ہے۔ ایک طرف تو وہ یہ اصول پیش کرتا ہے کہ اصلح ہی الباقی ہے مگر دوسری طرف وہ اس بات کا بھی قائل ہے کہ انواع کی تبدیلی سب کچھ بخت و اتفاق سے ہو رہی ہے ڈارون اپنے فکر کی بنیاد کے لیے صرف حیوانات اور نباتات کو لیتا ہے مگر اس کا یہ اندازِ فکر صحیح نہیں سائنس کے اصولوں کی ایک بنیادی صفت ان کی ہمہ گیری ہے۔ ڈارون کا نظریہ ارتقاء اسی صورت میں صحیح اور درست مانا جاسکتا ہے اگر وہ کائنات کے ہر نوعی تغیر کی وجہ اور علت کی صحیح صحیح نشاندہی کرے۔ ڈارون یہ تو بتاتا ہے کہ حیوانوں نے کس طرح دھیرے دھیرے بالکل تدریجی طور پر نہایت ہی خفیف تغیرات کے جمع ہوتے رہنے سے انسانوں کا روپ دھار لیا اور اس طرح ایک نئی نوع وجود میں آگئی۔ مگر وہ اس کائنات کی ابتدائی کڑیوں سے کچھ بحث نہیں کرتا۔ وہ ہمیں یہ نہیں بتاتا کہ دنیا میں جو غیر معین توانائی موجود تھی اس کے بطن سے معین مظاہر کیسے پیدا ہو گئے۔ اگر کائنات کا یہ سارا کارخانہ بے مقصد اور بے ارادہ بغیر کسی منصوبہ بندی کے چل رہا ہے تو پھر فکری دلیل حیران و ششدر رہے کہ اس بے منصوبہ عمل سے نظم و ربط کیسے ظاہر ہو گئے۔ وحدت کثرت میں کس طرح جلوہ گر ہو گئی۔ ارتقاء کے میکانکی اور اندھے لزوم سے شعور و ذہن کیسے معرضِ وجود میں آگئے۔ معاملہ پھر اسی پر ختم نہیں ہوتا بلکہ انسان کا دل بیتاب شعور کی اگلی منزلیں جو سلسلۂ ارتقاء میں مضمر ہیں ان کی کنہ معلوم کرنے کے لیے بھی مضطرب رہتا ہے مگر ڈارون اور اس کے ہم خیال اس معاملے میں بالکل خاموش ہیں۔

(۳) اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ انتخاب طبیعی چھوٹے چھوٹے تغیرات کے تدریجی اور آہستہ آہستہ اجتماع کے ذریعہ عمل کرتا ہے تو پھر دنیا کو دو نوعوں کے درمیان تحول پذیر (TRANSITIONAL) صورتوں کے جانوروں سے لبریز ہونا چاہیے تھا۔ لیکن ہم ساری دنیا میں متعین اور مقرر صورتوں کی انواع دیکھتے ہیں۔ پانچ ہزار برس کا تاریخی ریکارڈ اس بات پر شاہد ہے کہ جس شکل و صورت کے جانور آج سے ہزاروں برس پہلے تھے ویسے ہی آج تک ہیں۔ اور کبھی کوئی ایسا جانور نہیں دیکھا گیا جو دو نوعوں کے درمیان عبوری صورت میں ہو۔ یہ اعتراض ایسا ہے جس کا کوئی جواب نہیں دیا جا سکتا۔

(۴) انتخاب طبیعی ان خفیف تبدلات کی اصل اور ان کے استمرار کی کوئی توجیہ نہیں کر سکتا جو اپنے مرحلہ اساس ہیئت (RUDIMENTARY STAGE) میں کچھ بھی مفید نہیں ہوتے۔ جب انتخاب طبیعی کے ذریعہ ایک نوع دوسرے نوع کا روپ دھارتی ہے تو اس تبدیلی کے مابین بہت سے پرانے اعضاء غیر مفید اور بیکار ہو کر خود بخود فنا ہو جاتے ہیں اور اُن کی جگہ نئے اعضا جو ایک بالکل نئی نوع کے بقائی ضمانت ہوتے ہیں خود بخود معرض وجود میں آتے ہیں۔ لیکن یہاں ایک عجیب و غریب پیچیدگی سامنے آتی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ نئے اعضا فوراً ہی کام تو نہیں شروع کر دیتے۔ اُن کے مفید اور کار آمد ثابت ہونے سے پیشتر انہیں بہت ہی پُر پیچ مراحل میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ان درمیانی منازل کی افادیت آخر کس کے حصّہ میں آتی ہے۔ نئی نوع یا پرانی نوع کے۔ اس کا جواب عام طور پر یہ دیا جاتا ہے کہ کوئی نوع تغیر کی جس منزل میں ہو گی اُسی مرتبہ کے اعتبار سے اعضاء اس کے کام آئیں گے۔ لیکن اس جواب سے ہماری اصل الجھن دور نہیں ہوتی۔ اعضاء تبدیلی کے ہر مرحلہ میں مفید نہیں ہیں۔ بلکہ ارتقاء اور ترقی کی ایک خاص حد پر پہنچ کر کسی افادیت کے حامل ہوتے ہیں۔ ان عبوری منزلوں میں آخر وہ کونسی قوتیں ہیں جو ایک نوع کو دوسری میں منتقل کرنے میں مدد و معاون ثابت ہوتی ہیں؟ تغیر پذیر حالات میں نو ان میں اتنی قوت پیدا نہیں ہو سکتی کہ وہ اس عمل کو خوش اسلوبی سے سرانجام دے سکیں۔ اس کے لیے انہیں اس وقت کا انتظار کرنا پڑتا ہے جب وہ قوت و طاقت کے ایک خاص معیار تک پہنچ جائیں۔ پھر انتخاب طبیعی

سے نہایت پیچیدہ اعضاء مثلاً آنکھ کے ارتقاء کی توجیہ نہیں ہو سکتی جو بہت سے اجزاء پر مشتمل ہے۔ ایسے اجزاء اُس وقت تک کام نہیں کر سکتے جب تک کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ نہایت صحت اور باریکی کے ساتھ وضع نہ کیے جائیں۔

(۵) ڈاروِن کا اعتقاد ہے کہ ارتقاء نتیجہ ہے تنازع للبقاء کا، اور یہ کہ انواع کا تحول (تبدیلِ ہیئت یا تحویلِ جسم) اس جگہ بہت نمایاں ہوگا جہاں تنازع للبقاء زیادہ سخت ہوگا لیکن اعداد و شمار ڈاروِن کے اس نظریہ کی تائید نہیں کرتے۔ ایک روسی ماہر نباتات نے ایک لمبے تجربے اور گہرے مشاہدے کی بنا پر ڈاروِن کے اس خیال کو یکسر باطل ٹھہرایا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ نئی انواع اُن جگہوں پر جلدی اور آسانی کے ساتھ معرضِ وجود میں آتی اور ترقی کرتی ہیں، جہاں تنازع للبقاء کا عمل بہت کمزور ہوتا ہے۔ یہ عمل تو بجائے نئی انواع کی تخلیق کرنے کے اُن کے تغیر کے راستے کو روکتا ہے اور یہ کسی صورت میں بھی ان نوعی تغیرات کے لیے مفید اور کارآمد ثابت نہیں ہوتا۔